ISSN (Print): 2709-9636 | ISSN (Online): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

ماخذ تحقیقی مجلہ

اعجاز نسیم

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو واقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

ڈاکٹر لیاقت علی

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو واقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

آزادی کے بعد اردو ادب میں بہاول پور کی افسانہ نگار خواتین کا حصہ

Ejaz Naseem
Ph.D Scholar, Department of Urdu & Iqbaliyat, Islamia University, Bahawalpur.
Dr. Liaqat Ali
Associate Professor, Department of Urdu & Iqbaliyat, Islamia University, Bahawalpur.

Bahawalpur Fiction Writers share Women's Part in Urdu Post-Independence

The land of Bahawalpur is an important part of Pakistan. This excellent historical inheritance is situtated in the heart of Pakistan. This territory has its own separate recognition in the light of knowledge and literature. The beginning of Urdu prose in Bahawalpur was begun by Mirza Muhammad Ashraf Gorgani’s Shama Shami, Bin Basi Rustam. While Ali Ahmad Riffat, Mahmood Ali Fasoon and Hnayat Tareen explored the literary tradaition by writing their fictions. After the establishment of Pakistan, men and woman partricipated actively in the Urdu fiction. Besides the men writers of fiction, there is a large list of women writers, who in comparison with men writers, wrote while taking quality and quantity into account. They not only discussed the problems of women but also written fiction while taking into account the techniques of art and artifice. In this research article after the independence of Pakistan. The women writers of fiction of Bahawalpur will be analyzed.

Keywords: *Fiction, Woman short story, Bahawal Pur, Excellent Historical Inheritance, The Literary Tradatian, After independence.*

بیسویں صدی اردو افسانے کی ابتداء، ارتقاء اور عہد شباب کی صدی ہے، جس میں افسانہ حقیقت پسندی سے رومانیت ،ترقی پسندی سے جدیدیت ،مابعد جدیدیت جیسے رجحانات کے تحت پروان چڑھا۔ قیام پاکستان کے بعد اردو افسانے میں مرد و خواتین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مرد افسانہ نگاروں میں، انتظار حسین، اے حمید، انور سجاد، غلام ثقلین نقوی، منشاء یاد، رشید امجد، ذکاء الرحمن، شہزاد منظر، مرزا حامد بیگ، مظہر الاسلام اور اکرام اللہ نے اردو افسانے کو نقطہ عروج تک پہنچایا۔ وہیں رضیہ فصیح احمد، بانو قدسیہ، الطاف فاطمہ، فرخندہ لودھی، خالدہ حسین، طاہرہ اقبال اور نیلم احمد بشیر اس سفر میں مردوں کے ہم قدم و ہم رکاب رہی ہیں۔ ان خواتین افسانہ نگاروں کی ایک لمبی فہرست ہے، جنھوں نے مرد افسانہ نگاروں کے مقابلے میں معیار اور مقدار کو سامنے رکھتے ہوئے افسانے لکھے۔ انھوں نے نہ صرف عورت کے مسائل کا تذکرہ کیا ہے بلکہ تکنیکی اور موضوعاتی اعتبار سے بھی افسانوی روائت کو آگے بڑھایا ہے۔

بہاولپور کی سرزمین ادبی لحاظ سے بڑی زرخیز ہے۔ اگر ہم بہاول پور میں افسانے کی روایت کی بات کریں تو بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں علی احمد رفعت، کے افسانے "شہید کا راز" نے بہاول پور میں اردو افسانے کی بنیاد رکھی، جو ۱۹۳۵ء میں ادبی جریدہ "جہانگیر" میں شائع ہوا۔ اس کے بعد محمود علی فسوں کا افسانہ "رقیب" اور حیات ترین کے کچھ افسانے ان کے مضامین کے مجموعے "پریشان جلوے" میں چھپے، لیکن اس دوران میں کسی افسانہ نگار کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہوا۔

بہاول پور میں افسانہ نگاری کی اس روایت کو آگے بڑھانے میں جن افسانہ نگاروں نے حصہ لیا ان میں محمد خالد اختر، شفیق الرحمن، ذکاء الرحمن ،سید جاید اختر ، جمیل اختر ، سید قاسم جلال ، نجم الدین احمد ،فاروق ندیم ،یوسف فضیل ،عمران اقبال، ریاض قدیر، لیاقت علی، گل زیب عباسی، ناصر حسنی، جمشید اقبال، اسلم سحاب ، محمود ظفر اقبال ہاشمی اور نیر مصطفیٰ شامل ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں میں جمیلہ ہاشمی، بشریٰ رحمن، بتول رحمانی، سکینہ جلوانہ، مزمل بھٹی، رفیعہ سرفراز، راحت وفا، انیلہ کوثر، صائمہ اکرم چودھری، سعدیہ قریشی، بینا طارق اور برجیس آراء خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے عورت کے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے عورت کی نفسیاتی، معاشرتی اور سماجی مسائل کو اپنے افسانوں میں بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔ بہاول پور کے افسانوی ادب میں سب سے معتبر نام جمیلہ ہاشمی کا ہے۔

جمیلہ ہاشمی اردو کی عہد ساز شخصیت ہیں۔ ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئیں۔ ۱۹۵۷ء میں افسانے لکھنے کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا افسانہ "دوخط" "لیل ونہار" لاہور میں شائع ہوا۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

"۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ ہفت روزہ لیل ونہار میں ایک مختصر سی کہانی چھپی۔ نام تھا "دوخط" پڑھی تو اچھی لگی۔ اس کے بعد کئی اور کہانیاں اس افسانہ نگار کی پڑھیں۔ اور وہ بھی اچھی لگیں۔ معلوم ہوتا تھا اردو افسانے میں نیا اور تازہ خون شامل ہو رہا ہے۔ جب بھی جمیلہ ہاشمی کی کوئی کہانی چھپتی، میں شوق سے پڑھتا۔" (۱)

جمیلہ ہاشمی ساری زندگی ادب کی آبیاری کرتی رہیں۔ انھوں نے افسانوں کے علاوہ ناول، ناولٹ اور ڈرامے بھی لکھے اور تلاش بہاراں کی اشاعت پر آدم جی ادبی ایوارڈ کی حق دار قرار پائیں۔ ان کے افسانوں میں معاشرتی الجھنوں کے ساتھ ساتھ جنسی پیچیدگیوں، تقسیم ہندوستان کے فسادات کے ضمن میں قتل وغارت گری اور خصوصاً عورتوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا بھرپور نقشہ کھینچا گیا۔ "برہا کی رات" "آگ کا روپ" "زہر کا رنگ" اور "چندن کی چتا" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ زہر کا رنگ میں مایا کی بے بسی دیکھیے:

"میں نے سدا سوچا تھا کہ من ہر میں ہر طرح سے مکمل عورت بنوں گی۔ ہمارے گھر میں میری دو بہنیں پہلے ہی روٹھ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میری ماں ان کے بچوں کو کوستی تھی اور اپنے نصیبوں کو روتی تھی جس نے بچپن سے ہوش سنبھالا تھا اپنے جی میں کہا تھا اگر میرا بیاہ ہوا تو میں کبھی روٹھ کر گھر نہیں آؤں گی۔ چاہے کسی بُرے سے بُرے آدمی کے ساتھ نباہ کرنا پڑے کروں گی۔ مگر ہوا یہ کہ دو چار سال میں ہی مجھے اپنے سے کیے ہوئے وعدے دیوانے کی بڑ لگے۔ بھلا جو تمہیں عورت ہی نہ سمجھے اس سے نباہ کا کیا سوال؟ کبھی کبھار گوتم کا سلوک مجھے ناقابل برداشت لگتا اسے میری رتی برابر پرواہ نہیں۔" (۲)

جمیلہ ہاشمی کا بچپن چوں کہ ہندوستان میں گزرا، اس لیے ہندوستانی معاشرہ اور وہاں کی تہذیب وثقافت نے جمیلہ ہاشمی کے ذہن پر گہرے اثرات چھوڑے۔ اسی لیے ان کے بیشتر افسانوں میں مسلمان کرداروں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم (ہندو و سکھ) کرداروں کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ "آہوے آوارہ" "نگارِ وطن" "دل خانہ خراب" اور "ووٹ" جیسے افسانے ہندو معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی کے اسلوب میں ہندوستانی معاشرے کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کے افسانوں میں ہندی لفظوں کی بھرمار نے ان کے اسلوب میں چاشنی پیدا کر دی ہے۔ جو عبارت کو بوجھل نہیں ہونے دیتی۔ جمیلہ ہاشمی لکھتی ہیں:

> ”تیج کو اپنے سینے سے لگائے میں نے پرارتھنا کی تھی۔ بھگوان! تو اس کی رکشا کرے گا۔ میں اسے تجھے سونپتی ہوں۔ چاروں دشاؤں میں طوفان اور ہوائیں اور بلوان دشمن ہیں۔“(۳)

جمیلہ ہاشمی ایک منجھی ہوئی مصنفہ ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں مختلف تکنیکس جیسے بیانیہ انداز، شعور کی رو، خود کلامی اور علامات کی مدد سے کہانیوں کو اتنا پُر اثر بنایا ہے کہ قاری کہانی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جمیلہ ہاشمی کے افسانے ”خالی گھر“ ”کیسری“ ”طوطا کہانی“ ”امر بیل“ اور ”دشت جنون پرور“ علامتوں کے اظہار کی بہترین مثالیں ہیں۔ جیسے افسانہ ”خالی گھر“ میں ایک ایسے گھر کا نقشہ کھینچا ہے جو حالات کی گردش اور اپنوں کی منافقانہ چالوں کی بدولت برباد ہو جاتا ہے اور وہاں الو بولنے لگتے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی لکھتی ہیں:

> ”پنڈتوں کے گھر میں الو چیخا، اور پھر پھڑ پھڑاتا ہوا ایک کوٹھڑی سے نکلا اور ہمارے سروں پر سے چکر لگاتا ہوا دوسری کوٹھڑیوں میں گھس گیا۔“ (۴)

جمیلہ ہاشمی نے اپنے افسانوں میں روائتی انداز نہیں اپنایا بلکہ آفاقی ادب تخلیق کیا ہے۔ ان کے افسانے تمام فنی لوازم کو پورا کرتے ہیں۔

بشریٰ رحمن بہاول پور کے افسانوی ادب میں بہترین اضافہ ہیں۔ اگر یوں کہا جائے کہ بشریٰ رحمن کے ذکر کے بغیر بہاول پور کی ادبی تاریخ نامکمل ہے تو بے جانہ ہو گا۔ ۱۹۴۴ء کو بہاول پور میں پیدا ہوئیں۔ ادب انہیں ننھیال کی طرف سے ورثے میں ملا۔ ان کی والدہ اپنے دور کی بہترین شاعرہ تھیں، لیکن ادب محض ورثے کے طور پر کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں کر سکتا جب تک خود اس میں فطری صلاحیت نہ ہو۔ انھوں نے مختلف اصناف ادب (شاعری، سفر نامہ، کالم نگاری، ناول نویسی اور خطابت) میں طبع آزمائی کی، لیکن بہ طور فکشن نگار بشریٰ رحمن نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ ان کے پہلے ناول ”چارہ گر“ کو آدم جی ادبی انعام سے نوازا گیا۔ ان کا پہلا افسانہ ”دل اور دفتر“ ہے۔ جس میں ازدواجی زندگی کی تلخ حقیقتوں کا پتا چلتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ”بہت عرصہ ہوا میں نے بشریٰ رحمن کا افسانہ پڑھا ”دل اور دفتر“ بشریٰ رحمن کا یہ پہلا افسانہ تھا۔ پڑھا اور پسند آیا۔ بشریٰ نے میاں بیوی کے جذباتی تعلقات کی بنیاد پر قلم اٹھایا اور

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

ظرف بینی کا ثبوت دیتے ہوئے نازک موضوع پر دلچسپ افسانہ تحریر کرنے میں کامیاب رہی تھیں۔" (۵)

بشریٰ رحمن نے عورت کو اپنے افسانوں کا مرکز بنایا ہے۔ وہ عورت کسی خاص طبقے سے تعلق نہیں رکھتی بل کہ وہ مردوں کے اس معاشرے میں ہر عورت استحصال کا شکار نظر آتی ہے۔ کہیں کوئی عورت کسی جاگیر دار کے ظلم وستم کا شکار ہے تو کہیں معاشرے کے منافقانہ رویوں کا۔ لیکن بشریٰ رحمن نے ہر جگہ عورت کے مسائل اور ناروا سلوک کو صداقت اور حقیقت کے روپ میں پیش کیا ہے۔ "شرمیلی" "میقی ملک" "توفیق ذات" "اپنے دکھ کسے دوں" اور "سجدہ" عورت کے استحصال کی عمدہ مثالیں ہیں۔ نجم شاہین کھوسہ لکھتی ہیں:

"وہ سوچتی مردوں کی طرح، محسوس عورت کی طرح کرتی ہیں اور لکھتی اپنی طرح ہیں۔" (۶)

بشری رحمن نسوانیت کے اظہار پر قدرت رکھتی ہیں۔ کہیں وہ ممتا کے جذبے کی تسکین کرتی نظر آتی ہیں تو کہیں اپنی مجازی خدا کے ظلم وستم کو صبر سے برداشت کرتے دکھارہی ہیں۔ وہ کہیں بھی مرد کے مقابلے میں عورت کی فضیلت کی قائل نہیں۔ عورت کو رشتوں سے بندھی ہوئی ذات کے طور پیش کرتی ہیں۔ بشریٰ کی کہانیوں میں عورت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوا گر ہے۔ یہ عورت شرمیلی کی شفو ہو یا پے انگ گیسٹ کی زینی، معمولی آدمی کی قدسیہ ہو یا توفیق ذات کی تاجور، یہ تمام عورتیں رشتوں کو نبھاتی ہوئی شکت ذات سے دوچار ہوتی ہیں۔ لیکن شکائت کا ایک لفظ زبان سے ادا نہیں کرتیں۔ بشریٰ رحمن کے افسانوں کی لڑکیاں ہمیشہ اس سے ناخوش رہتی ہیں کیوں کہ ہ وہ انہیں آزادئ اظہار کا موقع نہیں دیتیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

"بشریٰ رحمن کے افسانوں کی لڑکیاں اس لیے ناشاد اور نامراد رہتی ہیں کہ جذبات کے چناب میں وہ صرف کچے گھڑے پر ہیں۔ حالاں کہ عشق کرنے والی عورت کو اپنے لیے کچے گھڑے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو منجدھار میں ڈوبنے والے مرد کے لیے پختہ گھڑے میں تبدیل ہو سکتی ہے۔"(۷)

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

بشریٰ رحمن ایک قد آور اور متنوع موضوعات کی حامل افسانہ نگار ہیں۔ زبان وبیان پر عبور رکھتی ہیں۔ کہیں کہیں عورت کی مخصوص زبان استعمال کر کے اپنے افسانوں میں فطری رنگ پیدا کرتی ہیں۔ منظر نگاری کے ساتھ ساتھ مکالمہ نگاری کے لحاظ سے بھی وہ منفرد افسانہ نگار ہیں۔

بتول رحمانی اعلیٰ تعلیم یافتہ، صاحب بصیرت اور معاشرتی رویوں کی ترجمان افسانہ نگار تھیں۔ ۱۹۵۵ء کو بہاول پور میں پیدا ہوئیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور سے ایم ایس سی کیمسٹری کی ڈگری لینے کے بعد گورنمنٹ کالج برائے خواتین بہاول پور میں تدریسی فرائض سرانجام دینے لگیں۔ اپنی ماں بولی زبان ''سرائیکی'' سے خصوصی لگاؤ تھا۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے شعبہ سرائیکی میں اعزازی لیکچرر کے طور پر کام کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ''لہریں'' ۱۹۸۱ء میں ''اخبار جہاں'' میں چھپا۔ آپ اس وقت ریڈیو پاکستان میں بطور اناؤنسر بھی فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔ بعد ازاں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''چوتھی سمت'' شائع ہوا۔

بتول رحمانی کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ لیکن خاص طور پر عورت کے مسائل اور استحصال پر جتنے افسانے لکھے وہ بڑے اہم ہیں۔ اپنے افسانوں میں کرداروں کو بطور علامت استعمال کرنے کا گُر خوب جانتی ہیں۔ ''ننھی ابابیل'' ''رحیم کاکا'' اور ''خودکشی'' بتول رحمانی کے علامتی افسانے ہیں۔ دیوار کا عذاب میں علامتی انداز دیکھیے:

> ''کھیت سے آخری کسان اور کارخانے سے آخری مزدور بھی اٹھ کر دیوار چاٹنے چل دیا۔ اس پار جانے کے خواب نے ساری زبانیں کھردری کر دیں۔ یکلخت دیوار میں ایک سوراخ ہوا۔ ''نون'' ادھر کود گیا۔ ''میم'' نے سر ڈالا تو سوراخ سکڑ گیا۔ سر ادھر اور ٹانگیں اِدھر ''وہ'' دیوار کے پاس بالکل اس کی پھنسی ہوئی کمر کے قریب منہ لا کر چلائے۔ ''میم-! میم-!''۔۔۔۔ ہمیں بتاؤ۔ سامنے کے مکان کس رنگ کے ہیں۔۔۔۔؟ کتنی نہریں نظر آ رہی ہیں۔'' (۸)

بتول رحمانی معاشرتی کشمکش، سماجی ناانصافیوں، اخلاقی اقدار اور معاشرے میں موجود منافقانہ رویوں، بے حس اور خود غرض انسانوں کا نوحہ کرتی نظر آتی ہیں۔ ''قفس'' ''دانشور'' اور ''دوسری چیخ'' میں انسان کی ایسی ہی نفسیاتی الجھنوں کو بیان کیا ہے۔

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

بتول رحمانی کہانی بنانے اور بیان کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ وہ سادگی اور سچائی سے بیانیہ انداز اپناتے ہوئے کہانی کو آگے بڑھاتی ہیں۔ جملوں کی ساخت اور ترتیب میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ ''دیوار کا عذاب'' ''میں اور تم'' ''چوتھی سمت'' اور ''قرض مسیحائی'' ان کی بہترین کہانیاں ہیں۔

سکینہ اختر جلوانہ بھی بہاول پور کی اہم افسانہ نگار ہیں۔ جو سکینہ جلوانہ کے قلمی نام سے مشہور ہوئیں۔ ایک علمی وادبی گھرانے میں ۱۹۲۱ء میں پیدا ہوئیں۔ اس وقت سکینہ جلوانہ کے والد مولوی اختر علی ملازمت کے سلسلے میں بہاول نگر میں بطور ''آفیسر آباد کار'' فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ سکینہ جلوانہ کو علمی وادبی ماحول وراثت میں ملا۔ ان کے دادا مولوی عبد المالک عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ نویس بھی تھے انھوں نے ''شاہان گوجر'' کے نام سے گوجروں کی تاریخ لکھی۔ سکینہ جلوانہ کے بھائی محمد خالد اختر اردو ادب کے منفرد نثر نگار تھے، اس لیے علمی وادبی گھرانے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے سکینہ جلوانہ کا قلم وقرطاس سے رشتہ بچپن ہی سے قائم ہو گیا تھا۔ چوں کہ اس دور میں بچیوں کی تعلیم کو بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا، اس لیے میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہاول پور کے معروف خاندان کے چشم وچراغ افضل خاں جلوانہ سے سکینہ کی شادی ہوئی جس کی نسبت سے سکینہ اختر کی بجائے سکینہ جلوانہ مشہور ہوئیں

سکینہ جلوانہ کی ابتدائی تحریروں میں کوئی ادبی رنگ نہ تھا۔ وہ اپنی بیشتر کہانیاں لکھنے کے بعد پھاڑ دیا کرتی تھیں۔ لیکن محمد خالد اختر کی اصلاح کے بعد سکینہ جلوانہ کی کہانیاں ''بیاض'' ''فنون'' ''افکار'' اور ''دوشیزہ'' میں چھپنے لگیں۔ محمد خالد اختر لکھتے ہیں:

> ''بچپن میں میری بہن سکینہ کھلنڈری ہنسنے والی بے پرواہ سی لڑکی تھی۔ کھیل کود کی شوقین، میرے نام آنے والا بچوں کا رسالہ ''پھول'' اور دارالاشاعت پنجاب لاہور کی کہانیوں کی کتابیں جو ہم منگواتے تھے۔ آکر پڑھتی تھی تو مجھے خبر نہ ہوئی۔ برسوں بعد مجھ پر کھلا کہ ہمارے گھرانے میں اصل رائیٹر ''سکینہ'' ہے اور میں اس کے سامنے ایک کھوٹی چیز ہوں۔''(۹)

سکینہ جلوانہ کا افسانوی مجموعہ ''صحرا کی شہزادی'' (۲۰۰۱ء) میں کراچی سے شائع ہوا جس میں کل دس افسانے ہیں۔ ان کے ہاں موضوعات کی کمی نہیں۔ عورت کی نفسیات پر لکھنا اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ انھوں نے نفسیاتی تقاضوں کو نبھاتے ہوئے کرداروں کی حرکات وسکنات کو فطری انداز میں آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

ان کے افسانے ''ماریا'' ''مریض محبت'' اور ''صحرا کی شہزادی'' میں عورت کے کرب کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ افسانے ''ماریا'' کی کہانی جاگیر دار طبقے کی نمائندہ کہانی ہے۔ اونچے طبقے سے تعلق رکھنے والے سیٹھ عابد، کمال سعید اور شاہ جی اخلاقی برتری کا شکار ہو کر کس طرح عورت کی تذلیل کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''اُس کی لاش کو رات کے اندھیرے میں دفن کر دیا گیا۔ اس کو آوارہ اور بد چلن قرار دیا گیا۔ اس نے کیا دیکھا۔ یہ راز رہا۔ ماریا کے گھر کا نقشہ ایک جہاز کی طرح تھا۔ دونوں سروں پر کمال کی دونوں بیگموں کے گھر تھے۔ درمیان میں لمبی چوڑی غلام گردشیں تھیں۔ یہ گھر ٹائی ٹینک شپ کی طرح ٹوٹنے لگا۔ لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔''(۱۰)

سکینہ جلوانہ نے اپنے افسانوں میں عورت کی نفسیات، مسلم گھرانوں کے مایوس اور مردہ ضمیر افراد کی تصویر کشی اور قیام پاکستان کے تناظر میں ہونے والے حادثات کو اپنی کہانیوں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ ''رام گلی'' ''بلا رہا ہے کوئی'' ''نر دوش'' ''صحرا کی شہزادی'' اور ''میرے جانے کے بعد'' موضوعات کے حوالے سے ان کی بہترین کہانیاں ہیں۔

رفیعہ سرفراز کا حقیقی نام رفیعہ قمر تھا، ۱۹۴۲ء میں بہاول پور میں پیدا ہوئیں۔ تعلیم یافتہ گھرانے کی فرد تھیں۔ ان کے والد اپنے زمانے کے عالم دین، شاعر، ادیب اور مترجم تھے۔ شیخ سرفراز علی سے شادی کے بعد رفیعہ سرفراز بن گئیں۔ محکمہ تعلیم سے وابستہ رہیں اور ڈائریکٹر سکولز کے عہدے سے سبک دوش ہوئیں۔

''پت جھڑ کے خواب'' کے نام سے ان کا افسانوی مجموعہ ۱۹۹۵ء میں عرفان پبلشرز بہاول پور نے شائع کیا۔ انھوں نے مرد اور عورت کے اٹوٹ ازلی رشتے کی مختلف صورتوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ کم عمری کی شادی اور اس کے بھیانک انجام پر بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ عصری شعور کی نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کو اپنے عہد میں ہونے والی تبدیلیوں سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ بشریٰ رحمن لکھتی ہیں:

> ''رفیعہ سرفراز ''پت جھڑ کے خواب'' گوندھتی ہیں۔ ساری مالا میں عورت ذات کا کرب ہے، محبت کی پیاس ہے اور انتظار کی نہ ختم ہونے والی پیشی ہے۔ وہ مافوق الفطرت ماحول میں ماورائی کردار لے کر کہانی کی بنت نہیں کرتیں بل کہ ان کی کہانیاں اسی معاشرے کی کہانیاں ہیں۔'' (۱۱)

رفیعہ سرفراز متوسط طبقے کی نمائندہ افسانہ نگار ہے۔ ان کے افسانوں میں سفید پوش لوگوں کے دکھ اور کرب کے علاوہ عصری مسائل جو انسانی زندگی اور معاشرے پر کسی نہ کسی انداز میں اثرانداز ہوتے ہیں اور جس کے اثرات صدیوں بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے افسانے "اوزون پھٹ رہا ہے" میں لکھتی ہیں:

> "یہ بے چارے جاپان والوں نے کیا قصور کر دیا کہ اس صدی کی ہر بڑی نئی مصیبت انھی پر ٹوٹتی ہے پہلے تو ائٹم بم کے دھماکوں نے بے چاروں کی نسلوں کو تباہ کر دیا ہے، پھر یہ سنا کہ جاپان کے ساحل پر بھاری پانی کے بے شمار ڈرم کسی اور ملک سے تیرتے ہوئے ساحل سے لگ کر ٹھہر گئے اور حکومت جاپان اور عوام حیران و پریشان ہو کر پھرتے رہے اور اب اوزون بھی انہیں کے سروں پر پھٹ رہا ہے۔"(۱۲)

مزمل بھٹی ۱۹۵٦ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ مزمل بھٹی نے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ایم اے اردو کیا اور اسی یونیورسٹی میں بہ طور استاد فرائض سرانجام دینے لگیں۔ "شہاب دہلوی احوال و آثار" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

مزمل بھٹی کی تصانیف میں دو مرتب شدہ کتابیں "پھر وہ منظر خواب ہوئے" اور "بہاول پور کی خواتین کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ" شامل ہیں۔ ایک افسانوی مجموعہ "گھگھو گھوڑے" شائع ہوا ہے۔

مزمل بھٹی نے اپنے بیشتر افسانوں میں عورت کو مرکزی کردار کے طور پر چُنا ہے۔ کیوں کہ اس معاشرے میں عورت بے شمار مسائل کا شکار ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے بے شمار مسائل، پیچیدگیوں اور بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اپنے منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ آسان اور سادہ زبان استعمال کرتی ہیں۔ عورتوں کی زبان استعمال کرنے اور ان کے جذبات کی عکاسی کرنے میں کمال رکھتی ہیں۔ "بد صورت" "وہ بھی زندگی ہار گئی" "سائیں میں نے پیٹ بیچا ہے" اور "میں پوری نہ تھی" یہ تمام افسانے عورت کی مظلومیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں وہ لکھتی ہیں:

> "حرام زادی! پہلے خود آوارہ تھی اب اسے بھی گشتی بنائے گی۔ کتی عورت جا۔ میرے گھر سے چلی جا، دفع ہو جا۔ گالیاں دیتا ہوا بخشو دروازے سے باہر نکل گیا۔ پتا نہیں نینا اور نسرین کو کب نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا، صبح جب وہ اٹھیں تو بخشو بے ہوش تھا۔"(۱۳)

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

ماخذ تحقیقی مجلہ

مزمل بھٹی اپنے افسانوں کے موضوعات اپنے ارد گرد سے ہی تلاش کرتی ہیں۔ ان کے کئی افسانے بہاولپور، یزمان اور اس کے ارد گرد کا جغرافیائی منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ ''روہی'' اور ''محقق'' افسانے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ ان کہانیوں میں ''روہی'' میں بسنے والے لوگوں کے رہن سہن، زبان و بیان اور اقدار کو بڑی مہارت سے پیش کرتی ہیں۔ کہیں کہیں روہی کی خواتین کی مخصوص زبان اور لب و لہجے کا استعمال بھی کرتی ہیں۔

راحت وفا اپریل ۱۹۶۸ء کو بہاولپور میں پیدا ہوئیں۔ ادبی زندگی کا آغاز زمانہ طالب علمی ہی سے کر دیا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ ''بھنور اور ساحل'' ماہنامہ آنچل میں شائع ہوا۔ ۱۹۹۹ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''بارش میری سہیلی'' منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد راحت وفا کے دو اور افسانوی مجموعے ''ہتھیلی پہ پانی'' اور ''مور کے پاؤں'' شائع ہوئے۔

انھوں نے اپنے ابتدائی افسانوں میں گھر کے اندر شکوک و شبہات کی وجہ سے پیدا ہونے والے چھوٹے چھوٹے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے عورت کے استحصال اور جہیز کی ناروا رسم کے علاوہ لڑکیوں کے مسائل کو زبان دینے کی کوشش کی ہے۔ ''پرانا سوٹ کیس'' ''ضمانت'' اور ''برف کا لباس'' عورت کی بے بسی کا نوحہ کرتی کہانیاں ہیں۔ وہ اپنے افسانے ''برف کا لباس'' میں لکھتی ہیں:

> ''لاجو کا خاوند فریاد جب اس کو بتاتا ہے کہ باہر ڈیوڈ کا ڈرائیور آ چکا ہے تم تیار ہو جاؤ تو وہ ایک لمحے کو اس کی طرف دیکھتی ہے اور پھر چلا اٹھتی ہے کہ دیکھتے نہیں کہ میں تیار ہوں دیکھو چھو کر دیکھو مجھے۔ میں پھر سے برف بن گئی ہوں۔ میرے وجود کی حرارت پھر ختم ہو گئی ہے۔'' (۱۴)

راحت وفا افسانہ بیان کرنے کا ہنر جانتی ہیں وہ اپنی تحریر کو دل کش الفاظ سے سجانے کی بجائے سادگی اور سچائی سے کہانی آگے یوں بڑھاتی ہیں کہ قاری سحر زدہ ہو جاتا ہے۔ طرز بیان اور جملوں کی ساخت و ترتیب میں ان کا انداز منفرد ہے۔ ''آسیب'' ''برف کا لباس'' ''مور کے پاؤں'' ''سفید لفافہ'' اور ''دروازہ'' ان کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔

انیلا کوثر ۱۹۷۵ء کو ملتان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد مہر محمد بخش بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن بہاول پور میں ملازمت کرتے تھے۔ اس لیے انیلا کوثر نے ابتدائی تعلیم بہاول پور سے حاصل کی۔ ۱۹۹۸ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے انگریزی میں ایم اے کیا اور درس و تدریس سے وابستہ ہو گئیں۔ لکھنے کا آغاز زمانہ

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

طالب علمی سے ہی کیا۔ ان کے ابتدائی افسانے مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔ ان کا پہلا افسانہ ”رسمیں“ اور پہلا افسانوی مجموعہ ”خواب نگر“ کے نام سے شائع ہوا۔ انھوں نے روائتی انداز اختیار کرتے ہوئے افسانے لکھے۔ انھوں نے اپنے اردگرد جو کچھ دیکھا، محسوس کیا۔ اسے افسانوی شکل میں پیش کر دیا۔ ان کے افسانے فرسودہ روایات، جنسی بے راہ روی، غربت، اخلاقی گراوٹ اور بچیوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ہیں۔ ان کے افسانے ”اف یہ رسمیں“ ”تم کو شہرت ملی“ ”جگنو کوئی راہ دکھلائے“ اور ”رقیب بنے حبیب“ بڑے اہم ہیں۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ”نوید کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ نہیں میں اس مقدمے کی بہت زیادہ توفیور نہیں کرتا۔ مگر کسی حد تک ضرور، آخر لڑکیوں نے زیادہ پڑھ کر کرنا کیا ہوتا ہے آخر کو گھر ہی سنبھالنا ہے۔ بہر حال اب تو تم پڑھ چکی ہو۔ مجھے تمہاری ڈگری پر کوئی اعتراض نہیں۔“ (۱۵)

انیلا کوثر کے ہاں موضوعات کی فراوانی نہیں، وہ روایتی انداز اپناتے ہوئے سادہ اور عام فہم زبان استعمال کرتی ہیں۔ مکالموں میں بھی ربط کا عنصر ناکافی ہے۔

بینا طارق ۱۹۷۶ء کو بہاول نگر میں پیدا ہوئیں۔ حقیقی نام روبینہ کوثر تھا لیکن بینا طارق کے قلمی نام سے لکھنے کا آغاز کیا۔ ایف اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمہ صحت میں بطور ایل ایچ وی کام کرنے لگیں۔ ان کا پہلا افسانہ ”شجر بے ثمر“ ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ پھر ۲۰۱۴ء میں اسی نام ”شجر بے ثمر“ سے ہی ان کا پہلا افسانوی مجموعہ شائع ہوا۔

بینا طارق کا پسندیدہ موضوع تانیثیت ہے۔ اس کی بیشتر کہانیوں میں عورت کے استحصال، مظلومیت، بانجھ پن اور بے اولادی کے سبب پیدا ہونے والے مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> ”میرا وجود کلر زدہ ذہن کی طرح جس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ کیا میرا وجود بھی کبھی ہریالی سے شناسائی حاصل کرے گا۔“ (۱۶)

بینا طارق نے اپنے افسانوں میں انسان کی نفسیاتی، معاشرتی، معاشی اور سماجی رویوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے اس حوالے سے ان کے افسانے ”سہاگن“ ”بھاگ بھری“ ”شجر بے ثمر“ اور ”بندگی، درندگی“ قابل ذکر ہیں۔ ”بندگی، درندگی“ میں میاں بیوی کی داستان حیات کا تذکرہ ہے کہ کس طرح ایک عورت چھوٹے

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

سے گھر میں ظالم مرد کی بے جا سختیوں کو جھیل کر گھر چلاتی ہے۔ بینا طارق نے معاشرے میں موجود ایسے مردوں کے غیر مہذب رویوں سے پردہ چاک کیا ہے ان کے افسانوں کے کردار اور کہانیاں مقامی ہیں۔ مکالمے موقع محل سے مطابقت رکھتے ہیں۔ وہ مناظر فطرت کو بیان کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔

سعدیہ اشرف قریشی بہاول نگر میں پیدا ہوئیں۔ زمانہ طالب علمی سے لکھنے کا آغاز کیا۔ ابتداء میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں جو "پھول کلیاں" "نوائے وقت" "ندائے ملت" "فیملی میگزین"، "انٹرنیشنل میگزین" "معاصر" اور "بیاض" میں چھپ چکی ہیں۔ سعدیہ اشرف قریشی ترجمہ نگار بھی ہیں۔ John Maxwell Coetzee کے نوبل انعام یافتہ ناول Life and time of Michael k کا اردو ترجمہ "زندگی اے زندگی" کے نام سے کیا، تاہم تخلیقی زندگی کا آغاز افسانوی مجموعہ "پیاسا دریا" سے کیا۔

سعدیہ اشرف قریشی کے موضوعات نچلے اور پس ماندہ طبقے کے لوگ ہیں جن کے درد و غم کی جھلک ان کے افسانوں میں واضح نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ افسانوں کے کرداروں میں اداسی اور محرومی کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ انھوں نے روز مرہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو بڑی مہارت سے اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر نجم شاہین کھوسہ لکھتی ہیں:

> "ان افسانوں میں تمام کردار پوری انانیت کے ساتھ اپنے بکھری دنیا سے مطابقت رکھتے ہیں۔ درد اور کرب کے تراشے پر حساس آنکھ کا پانی ہیں، جنہیں زیر قلم لاتے ہوئے آنکھیں نم ہوئیں۔ بے پایاں خواہشات کی تمازتوں کو محسوس کیا اور امید و بیم کی جلتی بجھتی شمعوں کے جلوس کو محور قصاں دیکھا۔ ساتھ ہی ساتھ انسان کی آہ کو آبلوں کی طرح چٹختے پایا ہے۔"(17)

سعدیہ اشرف قریشی کے ہاں عورت کے کردار زیادہ متحرک نظر آتے ہیں۔ وہ عورت کے نفسیاتی، سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کو سادہ انداز میں کہانی کہنے کا ہنر جانتی ہیں۔ "کلر" "جھوٹی چوڑیاں" "کالی چادر" اور "ان کہے دکھ" ان کے مشہور افسانے ہیں۔

برجیس آراء کا تعلق چشتیاں شریف ضلع بہاولنگر سے ہے۔ افسانہ نگاری کے میدان میں بالکل نووارد ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "بند کتاب" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ انھوں نے بیانیہ انداز اپنایا ہے۔ ان کی کہانیاں سادگی اور سلاست کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کے افسانے گوشت پوست کے انسانوں کے افسانے ہیں، جو ہم لوگوں

کے درمیاں رہتے ہیں۔ وہ زیادہ تر ایسی کہانیاں لکھتی ہیں جو ان کے ارد گرد رونما ہوتی ہیں۔ خاور چودھری ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "برجیس آراء کے باطن میں ایک مخصوص قسم کا سینسر فٹ ہے۔ یہ سینسر معاشرے میں نمو پذیر ان رویوں اور رجحانات کی نشان دہی کرتا ہے جو ہماری اقدار کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔"(۱۸)

برجیس آراء کے افسانوں میں معاشرتی تہذیب و تمدن کی گہری چھاپ ہے۔ مرد اور عورت کے اٹوٹ رشتوں کی مختلف صورتوں کو انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ازدواجی رشتے جہاں ایک طرف مضبوط اور مستحکم ہوتے ہیں، وہیں کچے دھاگے کی مانند کمزور بھی ہوتے ہیں، اس لئے ذرا سی بے احتیاطی سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ امیری اور غریبی کے درمیان حائل ہونے والے فاصلے، ماں باپ کی نافرمانی اور نوجوانوں کا ہیجانی انداز اور معاشرے کی بے حسی وہ موضوعات ہیں جن کو مصنفہ نے اپنے افسانوں میں برتا ہے۔ "وقت کی گردش" "پاگل" "داداجی" "دوسراروپ" اور "میری کہانی" میں معاشرے کی بے حسی اور اپنوں کا گلہ کرتی نظر آتی ہیں۔

"میری کہانی" افسانہ مکافات عمل کی کہانی ہے جس کا مرکزی کردار اپنے والدین کا نافرمان ہے۔ اسے رشتوں کی کوئی پہچان نہیں ہے۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کے سمجھانے کے باوجود وہ نہیں سمجھتا، لیکن جب اس کی اپنی شادی ہوتی ہے تو اس کے بچے اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے ہیں، جیسا وہ اپنے والدین سے کرتا تھا۔ مصنفہ لکھتی ہیں:

> "آج چالیس سال بعد وہ رات مجھ پر آن پڑی ہے جو میرے ابا پر آتی تھی۔ میں سونے کی کوشش کر رہا تھا، مگر ابا کی کھانسی کہیں مجھ میں سرائت کر چکی تھی۔ جیسے ابا کی روح مجھ میں داخل ہو گئی ہو۔ کھانس کھانس کر میرا برا حال ہو رہا تھا۔ رات کا ایک بج رہا تھا، اسد ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔ شائد آتے ہوئے وہ بھی راستے میں یہی دعا مانگ رہا ہو۔ یا اللہ ابا سو رہے ہوں ورنہ۔۔۔۔۔"۔(۱۹)

"دوسراروپ" ہیجانی کیفیت میں مبتلا ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو کسی بھی لڑکی کو دیکھ کر اس سے اظہار محبت کا خواہاں ہے لیکن وہ اپنے ہیجانی اور غیر فطری رویے کی بدولت رشتوں کی توقیر بھی بھول جاتا ہے۔ "پاگل" افسانہ معاشرتی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ سادہ اسلوب کی حامل افسانہ نگار ہیں۔ امید کی جاتی ہے

ISSN (**Print**): 2709-9636 | ISSN (**Online**): 2709-9644
Volume 2, 2021(Issue III, July to September)

کہ وہ آئندہ بھی بہتر افسانے لکھ کر بہاول پور کے افسانوی ادب میں اضافہ کریں گی۔"بند کتاب" "پولیس لائن ہاؤس" اور "داداجی" ان کی اچھی کہانیاں ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، "تبصرہ یادرفتگان جمیلہ ہاشمی"، مشمولہ: ہفت روزہ لیل ونہار، کراچی، مارچ، ۱۹۸۵ء

۲۔ جمیلہ ہاشمی، "زہر کارنگ"، رائٹر بک کلب، لاہور جنوری ۱۹۸۳، ص ۴۴

۳۔ جمیلہ ہاشمی، "رنگ بھُوم"، رائٹر بک کلب، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۷

۴۔ جمیلہ ہاشمی، "آپ بیتی جگ بیتی"، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۴۸

۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، "(فلیپ) چُپ"، دعا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

۶۔ نجم شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، "خواتین کے حقیقی مسائل کی ترجمان بشریٰ رحمن"، مشمولہ، روزنامہ نوائے وقت، لاہور، ۱۲ دسمبر، ۲۰۱۱ء

۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، چپ کی داد مشمولہ، "چپ"، از بشریٰ رحمن، دُعا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹

۸۔ بتول رحمانی، "چوتھی سمت"، سرائیکی لائبریری، بہاول پور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۹

۹۔ محمد خالد اختر، "(فلیپ) صحرا کی شہزادی"، آج کی کتابیں، کراچی، ۲۰۰۱ء

۱۰۔ سکینہ جلوانہ، "صحرا کی شہزادی"، آج کی کتابیں، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۹

۱۱ ۔بشریٰ رحمن، "ایک تاثر"، مشمولہ پت جھڑ کے خواب، رفیعہ سرفراز، الفرقان پبلشر بہاول پور

۱۲۔ رفیعہ سرفراز، "پت جھڑ کے خواب" الفرقان پبلشر، بہاول پور، مئی ۱۹۹۵، ص ۱۵۱

۱۳۔ مزمل بھٹی، "گھگھو گھوڑے"، پبلشرز پریمئیر پرنٹر، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۵۳

۱۴۔ راحت وفا، "ہتھیلی پہ پانی"، القریش پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۸

۱۵۔ انیلا کوثر، "خواب نگر"، مکتبہ خواتین میگزین، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۰

۱۶۔ بینا طارق، "شجر بے ثمر"، بک ہوم پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۵

۱۷۔ نجم شاہین کھوسہ، ڈاکٹر، "ایک تاثر، پیاسا دریا"، سعدیہ اشرف قریشی، سعد پبلی کیشنز، لاہور

۱۸۔ خاور چودھری، (فلیپ) "بند کتاب"، از: برجیس آراء، تیسرارخ پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء

۱۹۔ برجیس آراء، "بند کتاب"، تیسرارخ پبلشرز، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۴۰